علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۹)

از: سعید احمد اکبر آبادی

گورنمنٹ کا اعلان چنانچہ ابھی گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا ہی کہ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کے آخری عشرہ میں شملہ سے اچانک حسب ذیل سرکاری اعلان شائع ہو گیا۔

"اس بات کا قطعی فیصلہ ہو گیا ہے" کہ علی گڑھ اور بنارس کی یونیورسٹی کا دائرۂ اثر اسی مقام تک محدود ہو جس میں کہ وہ یونیورسٹی قائم ہو،

اس اعلان نے ہندوستان کے مسلمانوں میں بددلی اور مایوسی ضرور پیدا کی لیکن یونیورسٹی کے لیے ان کا جوش و خروش کم نہیں ہوا۔

نواب وقار الملک علی گڑھ کی سکونت ترک کر کے مراجعت وطن کی تیاری کر رہے تھے، کیونکہ سکریٹری کے عہدہ سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ صحت خراب تھی یا ایں ہمہ گورنمنٹ کے اعلان کو پڑھ کر تڑپ اٹھے، اسی وقت اس اعلان کے جواب میں ایک طویل مضمون اخبارات میں شائع کیا اور اس میں صاف لکھا:

گورنمنٹ کے اس اعلان کے باوجود مسلمانوں کو بدستور اپنی خواہش پر قائم رہنا چاہیئے، کیونکہ اگر آج ہم اس پر رضامند ہو جائیں

تو کل کو خود ہمارے ہاتھ کٹے جاتے ہیں اور ہماری آئندہ نسلیں جو عدم الحاق کے نقصانات سے متاثر ہوں گی وہ ہم پر لعنت بھیجیں گی کہ ہم نے ایسے انتظام کو قبول کر کے اپنی نسلوں کو یونیورسٹی کے فوائد سے محروم کر دیا۔

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے گورنمنٹ سے مطالبہ کیا ہے کہ الحاق کو منظور نہ کرنے کے وجوہ بیان کرے اور اس کے بعد لکھتے ہیں:

یہ بات مدت سے محسوس ہوتی چلی آرہی ہے کہ گورنمنٹ غریبوں کو اعلیٰ تعلیم سے روکتی ہے، چنانچہ تعلیم کے اخراجات کا روز بروز بڑھتا جانا اس بات کی صاف دلیل ہے اور اب حال کا یہ اعلان تو سونے پر سہاگہ کا کام دیتا ہے۔

مسلمان زعماء کا ردِ عمل: یہ صرف نواب وقار الملک کا اپنا اور شخصی تاثر نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کے سب لیڈر اور سربرآوردہ حضرات کا ردِ عمل بھی یہی تھا۔

چنانچہ گورنمنٹ کے اس اعلان پر غور و خوض کرنے کی غرض سے ۱۱ر ۱۲ر اگست کو یونیورسٹی دستور کمیٹی کا جو جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا اس میں کمیٹی کے صدر سر راجہ محمود آباد نے ایک نہایت پر زور تقریر کی اور کہا:

ہمارا نصب العین الحاقی یونیورسٹی ہے، مقامی یونیورسٹی کا تو کبھی ہم نے خیال بھی نہیں کیا، گورنمنٹ کے اس اعلان کے باوجود ہم اب بھی الحاقی یونیورسٹی کی تائید میں ہیں اور رہیں گے، ہم برابر کوشش کرتے رہیں گے کہ ہمیں الحاق کا حق ملے۔

جناب صدر کی تقریر کے بعد کمیٹی کے سکریٹری ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے تار اور خطوط پڑھ کر سنائے جو اس موقعے پر کمیٹی کو موصول ہوئے تھے ان میں ایک تار سر آغا خاں کا اور خطوط میں ایک خط مولانا شبلی کا بھی تھا اور ان دونوں حضرات نے یونیورسٹی کے

الحاقی ہونے پر اصرار کیا تھا۔

ملک میں ترکِ موالات اور اس کے بعد تحریک آزادی نے ایک عام ذہن مسلمانوں میں یہ پیدا کر دیا تھا کہ ان میں جتنے لوگ خان بہادر، یا سر، یا نواب یا اسی قسم کا کوئی اور خطاب رکھتے ہیں وہ حکومت کے خوشامدی اور اس کے غلام ہیں اور ان کو ملک و ملت کے مفاد سے کوئی واسطہ نہیں، یہ ذہن کس درجہ غلط اور حقیقت سے دور تھا۔ اس کا اندازہ اس ایک بات سے ہی ہو سکتا ہے کہ اس ایک یونیورسٹی کے معاملہ میں جتنے مسلمان خان بہادر، سر، نواب۔ راجہ وغیرہ حضرات ہیں وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خاطر انگریزی حکومت کے بالمقابل صف قائم کیے ہوئے ہیں۔ سر آغا خاں اور راجہ محمود آباد کا تو خیر کہنا ہی کیا ہے۔ وہ تو اس تحریک کے عظیم لیڈر تھے ہی، اس جلسہ میں پنجاب کے مشہور لیڈر میاں محمد شفیع (جو بعد میں سر اور وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کے ممبر بنے) موجود تھے۔ ان کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ انھوں تقریر کرتے ہوئے کہا

"میں پنجاب کے مسلمانوں کی طرف سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر گورنمنٹ کے دباؤ میں آکر آپ حضرات نے مقامی غیر الحاقی یونیورسٹی تسلیم کر لی تو پنجاب کے مسلمان یونیورسٹی دستور کمیٹی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔

آنریبل فخرالدین (جو بعد میں سر ہوئے) بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے کھڑے ہو کر کہا:

آنریبل میاں محمد شفیع نے جو خیالات الحاق کے بارہ میں پنجاب کے مسلمانوں کے بیان کئے ہیں وہی خیالات بہار کے مسلمانوں کے ہیں اور ان کا پیغام بھی یہی ہے کہ آپ لوگوں نے قوم کی بات نہ سنی اور مقامی یونیورسٹی لے کر بیٹھ گئے تو وہ آپ کے خلاف عدالتی کارروائی کریں گے"

ان پرجوش و ولولہ انگیز تقریروں کے بعد یونیورسٹی دستور کمیٹی نے ایک مفصل اور واضح رزولیوشن باتفاق آرا منظور کیا۔ جس میں اور باتوں کے ساتھ اس پر اپنے سخت افسوس کا اظہار کیا کہ گورنمنٹ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کو الحاقی ماننے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔
اس کے بعد یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کی میٹنگ ہوئی اور اس میں بھی اسی قسم کی پرجوش تقریریں ہوئیں۔ ادھر مسلمانوں کے اخبارات بھی مسلسل مضامین لکھ رہے تھے اور مسلمانوں میں حکومت کے خلاف سخت اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔

لیکن آگے چل کر خود کمیٹی کے ممبروں میں دو گروہ ہو گئے، ایک گروہ ان مسلمانوں کا تھا جو الحاق کے معاملہ میں گورنمنٹ کی بات تک سننے کا روادار نہیں تھا۔ اس کے بالمقابل ایک دوسرا گروہ تھا جس کو اعتدال پسند کہنا چاہیئے۔ اس گروہ نے محسوس کیا کہ اگر مسلمان الحاق کی شرط پر اصرار کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگا کہ مسلمان یونیورسٹی سے ہی محروم ہو جائیں گے اور یہ کونسی عقلمندی ہے کہ کھائیں گے تو گھی سے کھائیں گے ورنہ جی سے ہی جائیں گے۔

اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ہندوؤں نے الحاق کے معاملہ میں گورنمنٹ کی بات تسلیم کر لی تھی، اور اس بنا پر ۱۹۱۶ء میں ہندو بنارس یونیورسٹی قائم بھی ہو گئی تھی ان سب پہلوؤں پر نظر کر کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ وفد جس میں مولانا محمد علی مرحوم بھی تھے۔ پوشیدہ طور پر شملہ جا کر وائسرائے سے ملا اور اس نے غیر الحاقی یونیورسٹی کو تسلیم کر لیا۔

چونکہ مسلمانوں میں سخت ہیجان اور اشتعال تھا اس بنا پر ڈپوٹیشن نے چپ چپاتے حکومت سے یہ معاملہ طے کیا، لیکن جب اس کی خبر عام ہوئی تو مسلمانوں میں ڈپوٹیشن اور اس کی کارگزاری کے خلاف سخت بیزاری اور بددلی پیدا ہو گئی۔ اس خفیہ اجلاس اور اس کی کارروائی کا نام صحبتِ شبینہ رکھا گیا۔

مولانا شبلی نے بھی ڈیپوٹیشن کی ترتیب اور اس کی کارروائی پر سخت تنقیدی نظمیں لکھیں جن کا بڑا چرچا ہوا۔ لیکن اس معاملہ میں سب سے زیادہ نکتہ چینی مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ مولانا نے اس موضوع پر الہلال میں ایک دو نہیں متعدد مضامین لکھے جن میں مولانا کے سحرطراز قلم نے طنز و تشنیع کے وہ چمن کھلائے ہیں کہ باید و شاید!

ایک لمحۂ فکریہ لیکن آج جب کہ مسلم یونیورسٹی زمانہ کے گوناگوں انقلابات و تغیرات سے گزری ہوئی اپنی عمر کے باون برس پورے کر چکی ہے اس بات کا موقع ہے کہ یونیورسٹی کے معاملہ میں یہ جو کچھ ہنگامہ اور معرکہ بپا ہوا اس کا ایمانداری اور صاف دماغی سے جائزہ لیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد جن بزرگوں پر قومی فروشی اور حکومت پرستی کا الزام لگاتے ہیں کیا وہ الزام صحیح ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ الزام سرتاسر غلط اور بے بنیاد تھا۔ اور اس کی بنا قوم پروری کا وہ تصور تھا جو حریت پسندی کی تحریک کا زائیدہ تھا۔

لیعنی ہر وہ بات جو انگریز کی تائید میں ہو وہ قوم کے ساتھ غداری ہے اور ہر وہ اقدام جو حکومت کے خلاف ہو نیشنلزم، حریت پسندی اور قوم پروری ہے۔

اس یونیورسٹی کے معاملہ پر ہی غور کیجئے، اس سے متعلق گورنمنٹ نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کا نام مسلم یونیورسٹی ہوگا۔ اس میں مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہوگا، اس کا وائس چانسلر مسلمان ہوگا۔ کورٹ کے سب ممبر مسلمان ہوں گے اور چانسلر بھی کورٹ کا منتخب ہوگا۔ اب بجز الحاق کے مسلمانوں کا کونسا مطالبہ ہے جسے انگریزوں نے تسلیم نہیں کر لیا۔

رہا الحاق! تو سچ یہ ہے کہ اس معاملہ میں انگریزوں کا خیال درست تھا۔ اور

مسلمانوں کا مطالبۂ الحاق محض جذباتیت اور عاقبت نا اندیشی پر مبنی تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ سرسید کے ذہن میں یونیورسٹی کا جو تصور تھا وہ صرف مقامی اور غیرالحاقی یونیورسٹی کا تھا۔ جیسا کہ ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر ہے، ۹ اگست ۱۹۱۲ء کو تار کے ذریعہ شملہ سے گورنمنٹ کا جو مراسلہ سر راجہ محمود آباد کے نام روانہ کیا گیا تھا اس میں تمہید کے بعد تحریر تھا،

ہز مجسٹی کے وزیر ہند نے کامل غور و خوض کے بعد فیصلہ کر دیا ہے کہ مجوزہ یونیورسٹی کو اس بات کا حق نہ ہوگا کہ جس مقام پر وہ قائم ہے اس سے باہر الحاق کر سکے۔

اس کے بعد اس خط میں یہ بھی جتایا گیا تھا کہ:

سرسید بھی مقامی یونیورسٹی ہی بنانا چاہتے تھے۔ آگے چل کر چند دلائل الحاق کے نقصانات اور اس کی مضرت کے بیان کئے ہیں اور پھر لکھا ہے:

(ہز مجسٹی کے وزیر ہند اور گورنمنٹ ہند دونوں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ گورنمنٹ کے اس فیصلے سے مسلمانوں کو مایوسی ہوگی لیکن ان کو یقین ہے کہ آگے چل کر اس (عدم الحاق) سے مسلمانوں کو بہترین فوائد حاصل ہوں گے،

(وقار حیات ص ۵۸۳)

مذکورہ بالا عبارت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے اور انگریزوں کی فراست اور دور اندیشی کی داد دیجئے، انھوں نے مستقبل کے آئینے میں جھانک کر یہ دیکھ لیا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب کہ ہندوستان آزاد ہوگا۔ اقتدار اعلیٰ ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوگا اور حکومت سیکولر ہوگی۔ اس وقت مسلم یونیورسٹی کا الحاقی ہونا مسلمانوں کے لیے وبال جان بن جائے گا۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج وہی وقت ہے، اُس زمانے میں مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ یونیورسٹی الحاقی ہو۔ لیکن آج مطالبہ یہ ہے کہ الحاقی نہ ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ جن مسلمانوں نے اُس زمانہ میں یونیورسٹی کا عدم الحاقی ہونا تسلیم کیا تھا ان کے سامنے یہ فائدہ جو ہم اب اٹھا رہے ہیں نہیں تھا اور صرف حالات سے

"یعنی حکومت کا سخت اصرار اور ہندوؤں کا بنارس ہندو یونیورسٹی کے متعلق اس بات کو مان لینا"

مجبور ہو کر وہ اپنے پہلے موقف سے ہٹ گئے تھے۔

لیکن اس میں حکومت پرستی کا دخل ذرا نہیں تھا اور یہ ایسا جرم قوم فروشی نہیں تھا جس پر شبلی اور ابوالکلام اس قدر شور مچائیں اور ڈپوٹیشن کو سخت برا بھلا کہیں، مولانا ابوالکلام آزاد اگر آج زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جا سکتا تھا کہ:

"حضرت! آپ اور آپ کی کانگریس ہمیشہ دنیا میں اعلان کرتے رہے کہ: ملک کی تقسیم نہیں ہونے دیں گے نہیں ہونے دیں گے۔

لیکن تاریخ گواہ ہے جب وقت آیا تو کانگرس نے حضرت والا کی صدارت میں چپ چپاتے مسلم لیگ کے ساتھ ملک کی تقسیم کا معاملہ طے کر لیا اور یہ سب کچھ (اور وہ بھی شملہ پر ہی) اس راز داری کے ساتھ ہوا کہ جب یہ خبر عام ہوئی تو مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خاں اور جمعیت علمائے ہند یہ سب حیران رہ گئے اور فرطِ غم واندوہ سے انہوں نے سر پیٹ لیا۔

پس اگر عدم الحاق کو مان لینا ملت کے ساتھ غداری تھا۔ در آنحالیکہ تجربہ نے بتایا کہ یہی فیصلہ بہتر اور یونیورسٹی کے حق میں مفید تھا۔ تو حضرت والا ارشاد فرمائیں کہ کانگرس کے تقسیم پر رضا مند ہو جانے کو کیا کہا جائے۔ جب کہ ہر شخص اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے کہ یہ فیصلہ نہایت غلط۔ صد درجہ عاقبت

اور ہند و مسلمان دونوں کے لیے نا قابل تلافی نقصانات کا حامل تھا۔ اور یہ نقصان صرف ایک ملک کا نہیں، بلکہ پورے ایشیا اور افریقہ کا نقصان ہے۔

انسان کی یہ فطرت بھی خوب ہے کہ خود ایک کام اپنے دیرینہ منشا اور مقصد کے خلاف حالات کی مجبوری سے کرتا ہے تو اس کی سیکڑوں تاویلات و توجیہات کرتا ہے لیکن وہی یا اسی قسم کا کوئی کام حالات کی مجبوری سے کوئی دوسرا کرتا ہے تو یہ پہلا شخص اس کے سو سو نام رکھتا اور اسے بدنام کرتا ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یونیورسٹی کی تشکیل | بہر حال ان سب مراحل و منازل سے گذرنے کے بعد آخر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بل مرکزی اسمبلی میں پیش ہوا اور منظور ہوا۔ اور اب علی گڑھ محمڈن کالج "

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ بل کو پیش کرتے ہوئے وزیر تعلیم نے جو تقریر کی تو اس میں اس مراسلہ کا حوالہ بھی دیا تھا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا تھا اور جس میں یہ کہا گیا تھا کہ:

یہ ایک نیا تعلیمی تجربہ ہے جس کو حکومت اور مسلمان قوم دونوں کا اعتماد حاصل ہے۔ اور یہ تجربہ مسلمانوں کی قوم کی تکمیل کا ذریعہ ہو گا۔

مرکزی وزیر تعلیم نے اس موقع پر جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا۔

اس بل کو پیش کر کے ہم ایک تعلیمی اقامتی یونیورسٹی کا اضافہ کر رہے ہیں۔ جدید طرز کی یہ یونیورسٹی مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ اور ہم کو امید ہے کہ یہ یونیورسٹی ہند کے مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے

میں ایک اہم پارٹ ادا کرے گی۔

مسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی کا قیام جس کے دروازے عالم گیر علم کے لیے کھلے ہوں۔ مسلمانوں کی ترقی کی ضامن ہوگی۔

یونیورسٹی کے لیے اس وقت جو ایکٹ بنا جو "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ نمبر ۴ سنہ ۱۹۲۰ء کہلاتا ہے۔ اس کی مختلف دفعات میں اس بات کا اہتمام کیا گیا تھا کہ یونیورسٹی صرف نام کی نہیں بلکہ کردار کی بھی مسلم یونیورسٹی ہو۔

مدیر برہان جنوبی افریقہ کے سفر پر

مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر برہان مارچ سنہ ۷۳ء کے پہلے ہفتہ میں تین ماہ کے لیے جنوبی افریقہ کے سفر پر تشریف لے گئے ہیں دوران سفر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مضمون کا سلسلہ لکھنے کا موقعہ مل سکا تو فبہا ورنہ ناظرین کرام مدیر موصوف کی واپسی تک زحمت انتظار فرمائیں۔

نیازمند، محمد ظفر احمد غفرلہٗ

ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۷۲ء کی مطبوعات

تفسیر مظہری اردو	گیارہویں جلد	مجلد	۱۷/-
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان		"	۱۱/-
انتخاب الترغیب والترہیب		"	۱۳/-
فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر		"	۱۱/-
اخبار التنزیل		"	۴/-

ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار جامع مسجد۔ دہلی ۶